اقبال اور ایران

جلال متینی

ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

بیدلے گر رفت، اقبالے رسید

بیدلاں را نوبتِ حالے رسید

ہیکلے گشت از سخن گوئی بپا

گفت "کُل الصَید فِی جَوف الفرا"

قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت

واحدے کز صد ہزاراں برگذشت

ملک الشعرا بہار (مرحوم)

اقبال اور ایران

"جلال متینی دانش گاہِ فردوسی، مشہد میں پروفیسر تھے۔ انقلابِ ایران کے بعد ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کا درجِ ذیل مقالہ "مجلۂ دانش کدۂ ادبیات و علومِ انسانی" فردوسی یونیورسٹی کے خاص شمارہ میں شائع ہوا جس کا تعلق علامہ اقبال کے سو سالہ جشنِ ولادت سے تھا۔ اس مقالے کا کچھ حصہ وہ ۱۹۷۷ میں بین الاقوامی اقبال کانگریس میں بھی پڑھ چکے ہیں!

مصنف :

مقالے کا آغاز علامہ کی ایک مشہور غزل سے ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
ای جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما[1]

بات ایک برہمن زادہ مسلمان کی ہے جس نے شہر سیالکوٹ ۔۔۔۔۔ کے ایک متوسط، پارسا اور دینِ مبین اسلام پر ایمان رکھنے والے خاندان میں آنکھ کھولی اور اپنی ذاتی استعداد و ذہانت کے باعث، نیز برصغیر اور یورپ میں اعلیٰ تعلیمات کے حصول کے بعد برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں سیاست، شاعری اور فلسفے میں عظیم شہرت پائی۔ اس کی بعض تصانیف کا تو اس کی زندگی ہی میں یورپ کی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو گیا تھا جبکہ اس کے اردو اور فارسی اشعار ایشیا کے فارسی اور اردو جاننے والے لوگوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان اشعار نے برصغیر کی ادبی و اجتماعی محفلوں میں بحثوں کا سامان بہم پہنچایا! اور وہ نہ صرف ایک صاحبِ نصب العین شاعر کے طور پر جانا گیا،

جس کے پاس برصغیر کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں کو بیدار کرنے اور مسلمانوں کی آزادی کے لیے ایک بہت بڑا پیغام تھا، بلکہ اس کی فلسفیانہ اور اجتماعی آراء ..... نے اسے صحیح معنوں میں "معمارِ پاکستان" کے لقب کا مستحق ٹھہرایا۔ (اس کے بعد ۱۹۳۰ء کے جلسۂ مسلم لیگ الہ آباد وغیرہ اور پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا ذکر ہے۔ م)

وہ شخص جس کی نمایاں صفات اور جس کے سیاسی و اجتماعی چہرے کے اساسی خدوخال کے بارے میں بالکل مختصر انداز میں اوپر اشارہ کیا گیا ہے، پاکستان کے نامور فلسفی اور عظیم شاعر علامہ محمد اقبال لاہوری ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب اس انسان کے سو سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر ..... پنجاب یونیورسٹی میں ایک پُرشکوہ مجلس برپا ہوئی ہے جبکہ اقبال کا خیال تھا کہ ؎

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود[۲]

"جب میں نے اس خاک سے بوریا بستر سمیٹا (فوت ہو گیا) تو سب نے کہا کہ وہ ہمارا جاننے والا تھا لیکن کسی نے یہ نہ جانا کہ اس مسافر نے کیا کہا، کس سے کہا اور وہ کہاں کا تھا؟)۔

آج دنیا بھر کے اربابِ نظر اس "شاعرِ فردا" کے حضور ــ کہ جس نے واقعی جب اپنی آنکھ بند کی تو دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ــ سرِ تعظیم خم کرتے اور اس کے اس شعر پر صدق و صفا کے ساتھ صاد کرتے ہیں ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانی را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہی![۳]

"لوگ میرے بعد میرے اشعار پڑھیں گے، سمجھیں گے اور کہیں گے کہ ایک خود آگاہ نے ایک دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہاں (کانگریس میں) موجود اربابِ دانش پر مخفی نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے کلام و آراء پر

اب تک مختلف زبانوں میں بہت سے مقالات و کتب لکھے گئے ہیں اور گذشتہ تیس برسوں کے دوران ایران میں بھی محققین اور فضلاء کے توسط سے، اس سلسلے میں بہت سے مقالے اور کتابیں فارسی زبان میں تحریر ہوئی ہیں، یعنی اسی زبان میں جسے اقبال نے اپنے کلام کے بہت بڑے اور بنیادی حصے کے لیے ذریعۂ اظہار بنایا۔ نتیجے کے طور پر اقبال لاہوری آج ایرانیوں کے لیے ایک آشنا شاعر ہے، اس کا مجموعۂ کلام ایران میں بھی چھپا اور وہاں کی بعض یونیورسٹیوں میں پڑھایا بھی جاتا ہے؛ اور یہ اس لیے ہے کہ ایرانی صرف اقبال کے ساتھ ہمدلی محسوس نہیں کرتے بلکہ ہم زبانی بھی اس کا سبب بنی ہے کہ وہ صمیمِ قلب سے اسے اپنا سمجھیں۔

اگرچہ اقبال کے بارے میں مختلف نکتہ ہائے نظر سے بات کی جا سکتی ہے، تاہم خاکسار اس مجلس میں خاص طور پر "اقبال اور اس کا زبانِ فارسی اور تاریخ تمدنِ ایران سے ارتباط" کے موضوع پر مقالہ پڑھے گا؛ اور اس سلسلے میں بھی، وقت کی کمی کے پیشِ نظر، صرف اہم نکات سے بحث کرے گا۔

(اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے علامہ اقبال کی تعلیم، شعرگوئی، مادری زبان پنجابی اور اردو اشعار کی اشاعت وغیرہ سے متعلق مختصراً بات کی ہے جس سے یہاں صرفِ نظر کیا جاتا ہے)۔

. . . . . اس کے ساتھ ساتھ اقبال برصغیر پاک و ہند میں اپنے ہموطنوں کی حالت، ان کی پسماندگی اور ضعف و زبوں کے برسوں کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچا کہ اس صورت حال سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ عمل پیدا کیا جائے، انہیں غلامی کے پُرسکون ساحل سے آزادی کے سمندر کی پُرشور امواج میں کھینچ لے جانا ضروری ہے، کیونکہ ؎

در جہان نتوان اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جان سپردن زندگیست[۴]

(دنیا میں اگر مردانہ وار جیا نہیں جا سکتا، تو دلیروں کی طرح جان دینا بھی زندگی ہے)۔

اقبال کے عقیدے کے مطابق اس بلند مقصد تک پہنچنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ ان (مسلمانوں) میں "خودی" اور خود اعتمادی کو تقویت دی جائے۔ ؎

"غافل از حفظِ خودی یک دم مشو"

"خودی سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہ رہ!"

چونکہ یہ امر برصغیر ہی کے مسلمانوں سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں سے بھی متعلق ہے، اس لیے اس نے تمام مسلمانوں کو اپنا مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تمہاری اس تمام تر بے سروسامانی کا علاج، ان سیاسی و جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہو کر، جنہوں نے تمہیں الگ الگ کر رکھا ہے، باہمی اتحاد و یگانگت میں پوشیدہ ہے۔"

اقبال نے اس عظیم پیغام کے ابلاغ کے لیے اردو زبان کو کافی و وافی نہ جانا، نتیجتاً اس نے فارسی زبان کا دامن تھاما اور ۱۹۱۵ عیسوی کے بعد سے اپنا بیشتر کلام اسی زبان میں کہا، تاکہ فارسی زبان کے وسیلے سے وہ مسلمانانِ عجم یعنی برصغیر، ایران، افغانستان، ترکی اور روس کے بعض علاقوں کے فارسی سے آشنا مسلمانوں کو اپنے پیام و پیغام سے آشنا کرے۔

اس نے اپنی آراء کے اظہار کے لیے فارسی زبان کو منتخب کرنے کی وجہ ان اشعار میں وضاحت سے بیان کی ہے: ۵

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست
ہندیم از پارسی بیگانہ ام
ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتاری دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام ۵

"اس مثنوی سے شاعری مقصود نہیں ہے نہ کسی قسم کی بت پرستی اور بت گری ہی اس سے درکار ہے۔"

"میں ہندی ہوں اور فارسی سے ناآشنا ہوں، میری کیفیت تو ہلال

کی سی ہے کہ میرا پیمانہ بھی (فارسی کے سلسلے میں) اس کی طرح خالی ہے
اگرچہ اردو زبان مٹھاس میں شکر کی مانند ہے لیکن خالص فارسی کی
طرزِ گفتار اس سے کہیں زیادہ مٹھاس کی حامل ہے
میری فکر اس کے جلوے سے مسحور ہوگئی اور میرا قلم نخلِ طور کی شاخ
بن گیا
میری فکر کی بلندی کے سبب فارسی میری فکر کی فطرت کے شایان ہے)

اقبال کا یہ اقدام مختلف نکتہ ہائے نظر سے لائقِ تحقیق و مطالعہ ہے:
اوّل یہ کہ ہم ایرانی اقبال کو اس بنا پر تعظیم اور تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو کے اس نامور شاعر اور فلسفی نے، جس نے ایران کو کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ اس کی کوئی صحبت رہی تھی لیکن اس نے صرف فارسی کتب کے مطالعے ہی سے اس زبان میں اتنا درک حاصل کر لیا تھا کہ اپنے فلسفیانہ اور اجتماعی افکار کے اظہار کے لیے اسے منتخب کیا۔ ہم اس عظیم انسان کا احترام کرتے ہیں کہ جس نے دعوتِ حق کو لبیک کہنے (وفات) سے چند لمحے قبل بھی . . . . . فارسی ہی میں یہ دو شعر گنگنائے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیری
دگر دانائے راز آید کہ ناید[۶]

"گذرا ہوا نغمہ شاید پھر آئے یا نہ آئے۔ حجاز سے بادِ نسیم کا گذر
اس طرف سے شاید ہو یا نہ ہو۔
اس فقیر کا زمانہ تو لد چکا۔ اب کوئی اور دانائے راز شاید آئے یا
نہ آئے۔"

(اس کے بعد انگریزی استعمار کی طرف سے برِصغیر میں فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنانے کا ذکر ہے اور یہ کہ اگرچہ پنجاب میں اردو خط و کتابت کی زبان تھی پھر بھی فارسی کو ایک خاص مقام حاصل تھا) . . . . علاوہ ازیں اگر ایک طرف خالص فارسی میں کہے گئے اقبال کے پُرمغز کلام نے

مذکورہ بالا ممالک میں قارئین کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کی اور اس اردو زبان کے شاعر کے توسط سے ، بیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ، ایران سے باہر بواسطہ فارسی زبان کی گرمی بازار میں اضافہ ہوا ، تو دوسری طرف اقبالؒ کا یہی ابتکار اس بات کا سبب بنا ہے کہ برصغیر کا یہ نامور فلسفی و شاعر ایرانیوں کے یہاں بے مثال شہرت و اقبال (نصیبہ) کا سزاوار ٹھہرے ۔ اس لیے کہ اگر اس نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے فارسی کی بجائے اردو زبان سے کام لیا ہوتا تو اس کے بارے میں ہم ایرانیوں کی واقفیت یقیناً بہت ہی کم ہوتی ، جس طرح یہاں کے اردو زبان کے محققین ، شعرا اور ادیبوں اور ان کی تصانیف وغیرہ کے بارے میں (خواہ وہ ماضی کے ہوں یا حال کے) ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں ۔ یہ بات لائقِ ملاحظہ ہے کہ اقبال کے توسط سے ، اس کے افکار کی تبلیغ و اشاعت کے لیے فارسی زبان کا انتخاب متعدد اسلامی ممالک میں مؤثر بھی رہا ہے اور ان میں فارسی زبان کی بے حد ترویج و توسیع کا باعث بھی ؛ پھر اس طرح ، اپنی شناخت کے لیے بھی ، اقبال ایرانیوں میں بڑی ہی اہمیت کا حامل رہا ہے ۔

ایک اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اقبال فارسی زبان کے علاوہ ایران کی تہذیب ، ادب ، عرفان اور تاریخ کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کی بعض اہم اور برگزیدہ شخصیات کے کلام و آثار سے بھی پورے طور پر آشنا ہے اور یہ بلاشبہ نتیجہ ہے اس کے اس گہرے مطالعے کا جو اس نے برسوں ایران کے عظیم مفکرین اور شاعروں کا کیا ۔ اس نے ان نامور عارفوں کے کلام کا خاص طور پر دقیق مطالعہ کیا ہے ۔ جیسے سنائیؒ ، عطار ، مولانا جلال الدین (رومیؒ) ، عراقی ، شبستری وغیرہ کیونکہ اس نے جگہ جگہ ان کا نام لینے کے علاوہ ان کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں ، چنانچہ فارسی شاعری سے آشنا ہر شخص اس کے کلام کے مطالعے سے یہ جان لیتا ہے کہ کس طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ' یہاں سے اس پیرے کے آخر تک ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب کی کتاب "اقبال ، شاعرِ مشرق" مطبوعہ تہران ۱۳۴۳ ش ص ۱۱۵ کا حوالہ ہے : مترجم)

'اس کی غزل شعرِ حافظ کی مانند نشۂ عرفان اور ذوقِ حکمت کی حامل ہے

خسرو اور عراقی کی غزل کا سوز و درد بھی اس میں ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی میں

اس نے رومی اور شبستری کے آہنگ و لحن کو باہم ملا دیا ہے ۔ ۔ ۔ ،

لیکن اس کی دوبیتیاں (دو دو اشعار کے قطعے یا رباعیاں) کچھ اور ہی

شے ہیں ؛ گرم ، اثر صورت اور زندگی کی تپش و ولولہ سے پُر ۔ ۔ ۔ ۔ پیام

کے فلسفیانہ درد اندوہ کا ایک ایسا مرکب جسے باباطاہر (عریان ہمدانی)
کے سوز و نوا نے شعلہ کی تندی و حرارت سے تیار کیا گیا ہے۔"

یہاں میں اس بات کا مختصراً ذکر کرنا چاہوں گا کہ اقبال شاعری اور شاعر کے لیے ایک خاص پیغام کا قائل ہے اور چونکہ وہ انسان پر شعر کے لفظی اثر کا معتقد ہے اسی لیے اس نے اپنے اجتماعی اور فلسفیانہ افکار کے اظہار و توضیح کے لیے شاعری کا انتخاب کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے:

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتی بی شاعری انبار گل
سوز و مستی نقشبندِ عالمی است
شاعری بی سوز و مستی ماتمی است
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است[۷]

"شاعر ملت کے سینے میں دل کی صورت ہے۔ جس ملت میں کوئی شاعر نہیں وہ مٹی کا ڈھیر ہے
سوز اور مستی ایک دنیا کا نقش سنوارنے والی ہے۔ سوز اور مستی کے بغیر جو شاعری ہوگی وہ محض رونا پیٹنا ہی ہوگا
شاعری سے مقصود اگر آدمی کو انسان بنانا ہے تو پھر ایسی شاعری پیغمبری کی وارث ہوگی۔"

نہ شعر است این کہ بردی دل نہادم
گرہ از رشتۂ معنی گشادم
بہ امیدی کہ اکسیری زند عشق
مسِ این مفلسان را تاب دادم[۸]

"جس سے میں نے دل بستگی اختیار کی ہے وہ شعر تو نہیں ہے! وہ تو میں نے رشتۂ معنی کی گرہ کھولی ہے
اس امید پر کہ عشق کوئی اکسیر لگائے گا میں نے ان مفلسوں کے تانبے کو چمکایا ہے!"

اب جہاں تک اقبال کے فنِ شعر گوئی سے بحث کا تعلق ہے تو یہ ایک الگ لیکن دل نشیں موضوع ہے، جس کی تفصیل و طوالت کا یہ مقالہ متحمل نہیں۔ اس ضمن میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اب تک ان کتب و مقالات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جن میں اس موضوع کو لیا گیا ہے۔

اقبال نے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ایران کے شعراء میں سب سے زیادہ عارف شعرا کی طرف توجہ کی ہے، خاص طور پر جلال الدین مولوی (رومیؒ) کا تو وہ شیفتہ و فریفتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی مثنوی "جاوید نامہ" میں اپنے اس روحانی سفر کے لیے اسے (رومیؒ کو) اپنے رفیقِ راہ اور رہبر کے طور پر منتخب کیا اور اپنے سوالات اس کے سامنے رکھے ہیں۔ تاہم اقبال، رومیؒ اور ایران کے دوسرے عارف شعرا کے درمیان جو فرق ہے اسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ اقبال نے فارسی کی عرفانی مثنویوں میں متداول عارفانہ مضامین کی بجائے اپنے فلسفیانہ، اجتماعی اور سیاسی افکار پیش کیے ہیں جن سے وہ برِصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا تھا؛ چنانچہ وہ خود بھی اس دُہرے پن کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا ہے کہ ہم دونوں میں سے ہر ایک کا ایک خاص عہد سے تعلق ہے ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من [9]

"میں نے رومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ میں نے اسرارِ جاں اس سے سیکھے
قدیم عصر کے دورِ فتنہ میں وہ تھا تو عصرِ حاضر کے دورِ فتنہ میں میں ہوں۔"

اس کے علاوہ اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی کے آغاز میں (جس میں انہوں نے فلسفۂ خودی پیش کیا اور بہت زیادہ شہرت پائی) صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ ایک رات اس نے مولانا جلال الدین کو خواب میں دیکھا اور انہوں نے اس طرح سے اس (اقبال) کی رہنمائی کی: (فاضل مقالہ نگار نے سولہ اشعار دیے ہیں۔ یہاں صرف پہلے دو اور آخری دو اشعار درج کیے جاتے ہیں: م)

ے

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم
دفترِ سربستهٔ اسرارِ علوم
جانِ او از شعله ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

زین سخن آتش بہ پیراہن شدم
مثلِ نَے ہنگامہ آبستن شدم
بر گرفتم پردہ از رازِ خودی
وا نمودم سرّ اعجازِ خودی [10]

"میں پیرِ رومؒ کے فیض سے پھر علوم کے سربستہ اسرار کی کتاب پڑھتا ہوں
اُس یعنی رومی کی جان شعلوں سے مالامال ہے (اس کے مقابلے میں) میں تو چنگاری کی مانند ایک لمحے کی روشنی ہوں"

اس بات سے میری بے قراری انتہا کو پہنچ گئی اور میں بانسری کی طرح ہنگامے سے پُر ہو گیا
میں نے خودی کے راز سے پردہ اٹھا دیا۔ میں نے خودی کے اعجاز کا بھید ظاہر کر دیا"

اقبال نے اپنے فارسی کلام میں کئی مقامات پر مولوی (رومیؒ) اور ان کی مثنوی کا بڑے احترام سے ذکر کیا ہے؛ مثلاً یہ کہ اُس نے پیرِ روم سے کئی نکتے یاد کیے، اس کی روح نے شمس تبریزی کی آگ میں غوطے لگائے۔ رومیؒ کی مثنوی فارسی زبان کا قرآن ہے؛ مولانا جلال الدین رومی کے لیے وہ یہ الفاظ و القاب لایا ہے: مولوی، جلال الدین رومی، ملّا، ملائے جلال، پیرِ عجم، پیرِ حق سرشت، رومی، مرشدِ روم، مرشدِ رومی، پیرِ رومی، پیرِ روم، آخوندِ روم اور روم ـــــ جبکہ شمس تبریزی کے بارے میں، جنھوں نے مولانا جلال الدین کی جان کو پھونک کے رکھ دیا تھا؛ وہ یہ الفاظ لایا ہے:

شمس، تبریزی (پیر تبریزی)، دانای تبریز اور تبریز۔

پھر یہ کہ اپنی مثنویوں میں اس نے بہت سے مواقع پر مولانا کا کوئی مصرع یا شعر یا اشعار لے کر انہیں تضمین کیا یا ان کے بعض اشعار کے مضمون میں بعض الفاظ بدل کر انہیں اپنے اشعار میں کھپایا ہے مثلاً ان میں مولانا کی اس مشہور غزل کے نو اشعار بھی ہیں جس کا مطلع یہ ہے (یہ غزل جاوید نامہ میں نقل ہوئی ہے) ؎

بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست
بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست [11]

"اے دوست! تو اپنے ہونٹ کھول کہ مجھے فراواں شکر کی آرزو ہے
چہرہ دکھا کہ مجھے باغ اور گلستان کی آرزو ہے"

اقبال نے اپنی مثنوی گلشنِ رازِ جدید، ساتویں آٹھویں صدی ہجری کے معروف عارف شیخ محمود شبستری کی مثنوی گلشنِ رازِ جدید کے جواب میں کہی۔ اس مثنوی کے آغاز میں اس نے اس موضوع کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

زجانِ خاور آن سوزِ کہن رفت
دمش واماند و جانِ او ز تن رفت
بہ طرزِ دیگر از مقصود گفتم
جوابِ نامۂ محمود گفتم
ز عہدِ شیخ تا ایں روزگاری
نزد مردی بجانِ ما شراری [12]

"مشرق کی روح سے وہ سوز ہی جاتا رہا۔ اس کی سانس رک گئی اور
اس کی روح جسم سے نکل گئی
میں نے ایک دوسرے انداز میں مقصد بیان کیا۔ میں نے محمود کی
کتاب کا جواب کہا
شیخ کے زمانے سے لے کر اس دور تک کسی بھی آدمی نے ہماری
جان کو آگ نہ دکھائی"

اسی مثنوی کی "تمہید" میں اس نے ان لوگوں کے جواب میں، جو اس پر شعرِ سخن کی تہمت لگاتے ہے

تھے۔ شبستری کے اس مشہور شعر کے استناد سے اپنا دفاع کیا ہے ؎

مرا زین شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید[۱۳]

"مجھے خود اس شاعری سے کوئی عار نہیں ہے کیونکہ سو صدیوں میں بھی ایک عطار پیدا نہیں ہوتا۔"

اقبال نے سنائیؒ (یعنی وہ حکیم سنائیؒ جس نے مولانا رومؒ کے دل میں آگ بھڑکائی) کے مزار، واقع غزنین، کی زیارت کے موقع پر اس سے اپنے اخلاص کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ اپنا ایک قسم کا موازنہ بھی کیا ہے ؎

آں حکیم غیب آں صاحب مقام
ترک جوش رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا او ز پنہاں در سرور
ہر دو را سرمایہ از ذوق حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں گشود
فکر من تقدیر مومن وانمود
ہر دو را از حکمت قرآں سبق
او ز حق گوید من از مردان حق[۱۴]

"وہ حکیم غیب اور صاحب مقام جس کے ذکر سے رومیؒ کی ترک جوشی ختم ہوگئی (ترک جوشی: کبھی ترک لوگ گوشت پوری طرح پکانے کی بجائے نیم پختہ رکھتے تھے۔ یہاں مراد نیم خام، خامی، ناپختگی، نامکمل) میں تو ظاہری طور پر مسرور ہوں اور وہ باطن میں، ہم دونوں ذوق حضور کی دولت رکھتے ہیں۔

اس نے تو ایمان کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور میری فکر نے مومن کی تقدیر ظاہر کر دی

ہم دونوں کا درس حکمت قرآں سے لیا ہے۔ وہ حق (خدا) کی بات کرتا ہے تو میں مردان حق کی۔"

ایک جگہ اس نے خدا سے اپنے لیے مولانا جلال الدین کے سے جوش و جذبہ، سوز و خسرو اور سنائی کے سے صدق و اخلاص کی دعا کی ہے۔

اقبال نے ارمغانِ حجاز کی ایک رباعی میں عراقی کے اشعار پڑھنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایک جگہ عراقی کے اس شعر پر تضمین کی ہے ؎

بہ آہنگِ حجازی می سرایم
نخستیں بادہ کاندر جام کردند[۱۵]

"میں حجازی لے میں گاتا ہوں، سب سے پہلی شراب جو جام میں انڈیلی گئی"۔

پھر "پیامِ مشرق" میں (نخستیں بادہ . . . . .) کا دوسرا مصرع بھی بڑی چابکدستی سے کھپایا ہے ؎

بہ خود باز آورد رندِ کہن را
می برنا کہ من در جام کردم
من این می چوں مغانِ دورِ پیشین
زچشمِ مست ساقی وام کردم[۱۶]

"جو جوان (تازہ، نئی) شراب میں نے جام میں انڈیلی ہے وہ پرانے
رند کو بھی ہوش میں لے آتی ہے
میں نے یہ شراب پرانے دور کے مغاں کی طرح ساقی کی چشمِ مست سے
ادھار لی ہے"۔

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کا ایک شعر اقبال نے اس طرح استعمال کیا ہے ؎

ظاہرش این جلوہ ہای دلفروز
باطنش از عارفاں پنہان ہنوز
"حمد بیحد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را"[۱۷]

"حضورؐ کا ظاہر تو یہ دلفروز جلوے ہیں مگر حضورؐ کا باطن ابھی تک عارفوں
سے مخفی ہے"۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیحد تعریف و ستائش ہے۔ وہ ذات کہ جس نے مشتِ خاک کو ایمان سے نوازا۔

'مسافر اور مے باقی' میں حافظ شیرازی کے درج ذیل دو مصرعے اقتباس کی صورت میں نظر آتے ہیں ؎

ہزار مرتبہ کابل ترا ز دہلی است
"کہ این عجوزہ عروسِ ہزار داماد است"
بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد "قلندری داند"

"کابل، دہلی سے ہزار مرتبہ اچھا ہے کیونکہ یہ کھوسٹ بڑھیا یعنی دہلی ایسی دلہن ہے جس کے ہزاروں شوہر ہیں
اقبال کی محفل میں آ، اور دو ایک ساغر چڑھا۔ وہ اگرچہ سر تو نہیں منڈواتا تاہم قلندری سے آگاہ ہے"۔

اقبال نے مشہور عارف مولانا جامی (جس نے اس کی جان میں آگ بھر دی ہے) کا بھی ذکر کیا اور اس سے اپنی ارادت کا اظہار اس کے ایک شعر پر تضمین سے کیا ہے ؎

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم
شعرِ لبریزِ معانی گفتہ است
در ثنای خواجہ گوہر سفتہ است
"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست"[۱۸]

"میں ملّا جامی کے اندازِ شعر گوئی کا مارا ہوا ہوں، اس کی نظم و نثر میری خامی کا علاج ہے
اس نے معانی سے پُر راز بیان کیا ہے اور خواجہ یعنی آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت میں موتی پروئے ہیں
(یہ شعر جامی کا ہے): حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دونوں جہان کی

کتاب کا دیباچہ ہیں۔ تمام دنیا غلام ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آقا ہیں۔"

اقبال کے فارسی اشعار سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس نے ایران کے صرف عارف شعرا کے دواوین ہی کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ یہاں کے دوسرے شعرا بھی اس کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں اور ان سے وہ پورے طور پہ آشنا ہے۔

چنانچہ "مثنوی مسافر" میں، جہاں وہ غزنین کے سفر کا ذکر کرتا ہے، اس نے فردوسی کو "دانائے طوس" اور "نکتہ سنجِ طوس" کے الفاظ سے یاد کیا اور نزاکتِ مضمون کے ساتھ محمود غزنوی کی مدح میں فردوسی کے ایک شعر سے، معمولی تغیر کے ساتھ، اس طرح اقتباس کیا ہے ؎

گنبدی در طوفِ او چرخِ برین
تربتِ سلطان محمود است این
آن کہ چون کودک لب از کوثر بشست
گفت در گہوارہ نامِ او نخست[19]

"ایک ایسا گنبد (نظر آیا) کہ جس کا طواف آسمان کر رہا ہے۔ یہ سلطان محمود کی قبر ہے۔
وہ (محمود) کہ جب کوئی بچہ کوثر سے اپنے ہونٹ دھوتا ہے (پہلی مرتبہ بولنے لگتا ہے) تو وہ اپنے جھولے میں سب سے پہلے محمود ہی کا نام اپنے ہونٹوں پہ لاتا ہے۔"

"جاوید نامہ" میں اقبال نے اس عنوان کے تحت "نمودار می شود روح ناصر خسرو علوی و غزلی مستانہ سرائیدہ غائب می شود" (ناصر خسرو علوی کی روح نمودار ہوتی اور ایک مستانہ غزل گاتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے) ـــ ناصر خسرو کے ایک قصیدے سے پانچ اشعار ترتیب کے بغیر انتخاب کیے ہیں اور انہیں غزلِ مستانہ کا نام دیا ہے۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے ؎

ای زنندہ ہمچون کردہ رخان از خونِ دَن
خونِ دَن خوشت بخواہد ریخت گردونِ مدن

"اے مستی و نشاط کے عالم میں ٹہلنے والے! تو نے خُم کے خون سے اپنے گال خُم کی طرح کر لیے ہیں۔ خُم کا خون تیرا خون بہا دے گا۔ خُم کے گرد چکر مت کاٹ۔"

ارمغانِ حجاز" میں "حضورِ رسالتؐ" والا حصہ اس نے منوچہری دامغانی کے ایک شعر سے اس طرح شروع کیا ہے۔

"الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل!
کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل"
خرد از راندنِ محمل فرو ماند
زمامِ خویش را دادم درکفِ دل ؂۲

ہاں اے فراش! خیمہ نیچے رکھ دے کیونکہ قافلے کے آگے چلنے والا پڑاؤ سے باہر نکل گیا ہے
عقل پالکی کو آگے چلانے سے عاجز رہ گئی تھی، اس لیے میں نے اپنی عنان دل کے ہاتھ میں تھما دی"۔

اقبال نے اپنے کلام میں اسی طرح سعدی شیرازی کے بعض اشعار کو بھی تضمین کیا ہے۔ مثلاً "نقشِ فرنگ" میں اس کا یہ مشہور مصرع —

"بنی آدم اعضای یک دیگر اند"

اور "ارمغانِ حجاز" میں یہ مصرع —

"مرا ای کاشکی مادر نزادی"

نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ "قطرۂ آب" کے زیرِ عنوان سعدی کے دو مشہور اشعار لا کر موضوعِ زیرِ بحث کو ایک نئی صورت میں پیش کیا ہے ؂

۱۔ مرا معنیِ تازۂ مدعا ست
اگر گفتہ را باز گویم رواست
۲۔ "یکی قطرہ باران ز ابری چکید
خجل شد چو پہنای دریا بدید
۳۔ کہ جایی کہ دریاست من کیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم"
۴۔ ولیکن ز دریا بر آمد خروش!
ز شرم تنک مایگی رو مپوش

۵۔ تماشای شام و سحر دیدہ ای
چمن دیدہ ای دشت و در دیدہ ای

۶۔ بہ برگ گیاہی بہ دوشِ سحاب
درخشیدی از پرتوِ آفتاب

۷۔ گہی ہمدمِ تشنہ کامانِ راغ
گہی محرمِ سینہ چاکانِ باغ

۸۔ گہی خفتہ در تاک و طاقت گداز
گہی خفتہ در خاک و فی سوز و ساز

۹۔ زِ موجِ سبک سیرِ من زادہ ای
زِ من زادہ ای در من افتادہ ای

۱۰۔ بیا سای در خلوتِ سینہ ام
چو جوہر درخشں اندر آئینہ ام

۱۱۔ گہر شو در آغوشِ قلزم بزی
فروزاں تر از ماہ و انجم بزی[۲۱]

۱۔ میں اپنے مدعا میں ایک نیا معنی لانا چاہتا ہوں۔ اگر میں کہی ہوئی بات کو پھر کہہ دوں تو روا ہوگا

۲۔ بادل سے بارش کا ایک قطرہ ٹپکا۔ جب اس نے سمندر کی وسعت کو دیکھا تو شرما گیا

۳۔ کہ جہاں سمندر ہے وہاں میری کیا حیثیت ہے۔ اگر وہ ہے تو سچی بات ہے کہ میں نہیں ہوں (۲ اور ۳ شعر سعدی کے ہیں)

۴۔ لیکن سمندر (اس کی یہ بات سن کر) چلّایا کہ اپنی کم مائگی کی شرم سے منہ نہ چھپا۔

۵۔ تُو (قطرے) نے صبح و شام کا نظارہ کیا ہے۔ تو نے چمن کو دیکھا ہے اور دشت و وادی کو دیکھا ہے

۶۔ کبھی گھاس کی پتی اور کبھی بادل کا سایہ رہا ہے اور کبھی باغ کے سینہ چاکوں (پھولوں) کا واقفِ حال

۷۔ کبھی تو مرغزار کے پیاسوں کا ساقی رہا ہے اور کبھی باغ کے سینہ چاکوں (پھولوں) کا واقفِ حال

۸۔ کبھی تو تُو تاک میں پوشیدہ رہ کر طاقت گداز بنا (شراب کی صورت میں) اور کبھی خاک میں بے سوز و ساز سو یا رہا

۹۔ تو میری ہی تیز رفتار موج سے پیدا ہوا ہے۔ مجھ سے پیدا ہو کر پھر مجھ ہی میں آ گرا ہے

۱۰۔ میرے سینے کی خلوت میں آرام کر اور میرے آئینے میں جوہر کی مانند درخشاں ہو

۱۱۔ موتی بن اور سمندر کی گود میں زندگی بسر کر۔ اس طرح چاند تاروں سے بھی زیادہ فروزاں رہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو نظیری نیشاپوری کا ایک مصرع اپنے ذوق کے مطابق بڑا ہی پسند آیا تھا جس کے سبب اس نے اسے دو مقامات پر تضمین کیا: ایک موقع پر تو اپنے قول کے ساتھ اور دوسرے موقع پر حلاج (منصور) کے قول کے ساتھ ؎

بہ ملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را
"کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" [۲۲]

"میں ملکِ جم کے عوض بھی نظیری کا یہ مصرع دینے کو تیار نہیں ہوں: کہ جو کوئی مارا نہیں گیا وہ ہمارے قبیلے ہی سے نہیں ہے"۔

ان شعرا کے علاوہ اس نے امیر خسرو دہلوی، عرفی شیرازی، ملک قمی اور عزت بخاری کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح اقبال نے اپنے اشعار میں بعض ایرانی علما، ادبا اور بزرگوں کے نام بھی لیے ہیں، جیسے ابوعلی سینا، جو بقول اقبال "صرف آب و گِل ہی کا جاننے والا اور دل کے زخموں سے بے خبر ہے"۔۔۔۔ محمد بن زکریا رازی اور خواجہ نصیر الدین طوسی کے بارے میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں "قیاسِ رازی و طوسی جنون است" (رازی اور طوسی کا قیاس جنون ہے) ۔۔۔۔ "جہانِ طوسی و اقلیدس است ابن (یہ طوسی اور

اقلیدس کی دنیا ہے) ـــــ اور بظاہر امام فخر رازی یا ابوالفتوح رازی کا بھی اس نے س طرح ذکر کیا ہے:

"نہ رازی حکمتِ قرآں بیاموز" (رازی سے قرآن کی حکمت سیکھو)۔

جاوید نامہ میں فلکِ مریخ کی سیر کے دوران مریخ کے ماہرِ نجوم کو رصد گاہ سے باہر آتے دکھایا گیا ہے۔ یہاں اس نے عمر خیام اور خواجہ نصیر الدین طوسی کے نام لیے ہیں۔ یہاں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس مریخی ماہرِ نجوم نے اقبال سے خالص فارسی میں باتیں کی ہیں۔ غزالی، فارابی، سید ہجویری اور سید جمال الدین اسد آبادی معروف بہ افغانی کے اسما بھی اقبال کے کلام میں مذکور ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے بہزاد کی مصوری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ایران سے متعلق اقبال کے یہاں ایک اور موضوع یہ نظر آتا ہے کہ فارسی ادب سے گہری واقفیت کے باعث اس نے فارسی کی عارفانہ غزل کی مروّجہ بہت سی اصطلاحات سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے جیسے: پیرِ میکدہ، پیرِ مغاں، مغ، مغ زادہ، مغ زادگان، مغ بچہ، . . . .، مغانہ، مغان، دیرِ مغان، رند، رندانہ، شیخِ شہر، واعظِ شہر۔ اور ان کا استعمال اس کے یہاں بالکل اسی انداز میں ہے جس انداز میں حافظ، عراقی اور دوسرے ایسے شعرا کے اشعار میں ہے۔

اقبال نے فارسی شعرا کے دواوین کا جس طرح بغور مطالعہ کیا ہے اس کے سبب وہ فارسی شاعری کے مروّجہ ادبی مظاہر و تعبیرات (ترکیبات و تلمیحات وغیرہ) سے بخوبی آگاہ ہے اور انہیں اس نے اپنے اشعار میں طبیعی طور پر استعمال کیا ہے: مثال کے طور پر اس نے ان ترکیبات و تلمیحات وغیرہ سے اپنے سیاسی و اجتماعی مقاصد کے اظہار کے لیے، نکاتِ تازہ کے ساتھ بہرہ حاصل کیا ہے: عشقِ شیریں و خسرو، فرہاد و شیریں، محمود و ایاز، شمع و پروانہ، بلبل و پروانہ، داغِ لالہ، گل و ریحان اور مرغِ چمن وغیرہ . . . . اسی وجہ سے ان کے کلام میں کوہکن، فرہاد، تیشہ، تیشۂ فرہادی، بیستون، کوہسار، شیریں، پرویز، خسرو، سُمِ شبدیز (خسرو پرویز کے گھوڑے کا نام شبدیز تھا) . . . . ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو خاصے لائقِ توجہ ہیں:

بگو از من بہ پرویزانِ ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
ز خاری گو خلد در سینۂ من
دلِ صد بیستوں را می تواں خست [۲۳]

"میری طرف سے اس دور کے پرویزوں سے کہہ دو کہ میں فرہاد نہیں ہوں

کہ کلہاڑی ہاتھ میں لوں
اس کانٹے سے، جو میرے سینے میں کھٹکتا ہے، سینکڑوں بیستون (پہاڑ) کاٹے جا سکتے ہیں۔"

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ [۲۴]

در عشق و ہوسناکیٔ دانی کہ تفاوت چیست
آن تیشہ فرہادی، ایں حیلۂ پرویزی [۲۵]

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقامِ گفتگوست
عشق بہ دوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را [۲۶]

من بہ سیمای غلامان فرِ سلطان دیدہ ام
شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آمد برون [۲۷]

آں شعلہ ام کہ صبحِ ازل در کنارِ عشق
پیش از نمود بلبل و پروانہ می تپید [۲۸]

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب
انقلاب، انقلاب ای انقلاب
واعظ اندر مسجد و فرزندِ او در مدرسہ
آں بہ پیری کودکی، ایں پیر در عہدِ شباب
انقلاب، انقلاب ای انقلاب

از آن پیش بتان رقصیدم و زنار بر بستم
کہ شیخ شہر مردے با خدا گردد ز تکفیرم

"افرنگ اور افرنگ کی دل آویزی کے ہاتھوں فریاد ہے، اس کی شیریں خصلتی اور پرویز فطرتی کے ہاتھوں فریاد ہے
تجھے علم ہے کہ عشق اور ہوسناکی میں کیا فرق ہے؟ وہ یعنی عشق فرہادی تیشہ ہے جبکہ یہ پرویزی مکر ہے
اگر فرہاد نے پتھر پر کلہاڑا چلا دیا تو یہ کونسی بڑی بات ہے، عشق تو یہ سب پہاڑ و ہاڑ کندھے پر اٹھا لیتا ہے
میں نے غلاموں کے چہرے پر سلطانی شان دیکھی ہے، محمود غزنوی کا شعلہ ایاز کی خاک سے بلند ہوا
میں وہ شعلہ ہوں جو صبحِ ازل عشق کے پہلو میں بلبل و پروانہ سے پہلے تڑپا تھا
شیخ شہر تسبیح کے دھاگے سے سینکڑوں اصحاب ایمان پر جال پھینکے ہوئے ہے۔ اُدھر سادہ دل کافروں کے لیے برہمن زنار کو بل پر بل چڑھائے ہوئے ہے۔ انقلاب، انقلاب اے انقلاب!
واعظ خود تو مسجد میں ہے اور اس کا فرزند مدرسے میں، وہ یعنی واعظ بڑھاپے میں بھی بچہ بنا ہوا ہے، جبکہ فرزند جوانی ہی میں بڑھاپے کا شکار ہے۔ کیسا انقلاب ہے، واہ عجیب انقلاب ہے
میں نے بتوں کے سامنے اس لیے رقص کیا اور زنار باندھی تاکہ شیخِ شہر مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کر کے باخدا آدمی بن جائے۔"

اقبال نے اپنے اشعار میں حال و ہوائے ایران کو بھی مسلسل پیش نظر رکھا ہے تاکہ ایرانی یا برصغیر سے باہر کے فارسی دان قارئین اس کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ کریں۔ اسی بنا پر اس نے ایران کے شہروں اور ان شہروں کا بھی ذکر کیا ہے جو کبھی فارسی زبان اور ایران کی تہذیب و معاشرت کی قلمرو میں شامل تھے۔ مثلاً: ہمدان، شیراز، تبریز، اصفہان، کاشان، خراسان، مدائن، بخارا،

"رند، مرد، خجند، کاشغر، . . . . پھر اس نے ایرانیوں کے جانے پہچانے پہاڑ کوہ الوند کا ذکر ایک ایسے پہاڑ کے طور پر کیا ہے جو بلندی و عظمت کا مظہر ہے ؎

شرع می خواہد کہ چون آئی بجنگ
شعلہ گردی واشگافی کام سنگ
آزماید قوتِ بازوی تو
می نہد الوند پیشِ روی تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را
از تفِ خنجر گداز الوند را [۳۱]

"شرع چاہتی ہے کہ جب تو حالتِ جنگ میں ہو تو اس وقت تو شعلہ بن جائے اور پتھر کا حلق چیر ڈالے
وہ تیری قوتِ بازو کو آزماتی ہے۔ تیرے سامنے کوہِ الوند رکھتی ہے پھر کہتی ہے کہ الوند کو پیس ڈال۔ خنجر کی گرمی سے الوند کو پگھلا ڈال۔"

جیسا کہ واضح ہے اقبال نے اپنے ملک کے حوالے سے، جوانی میں ہمالیہ پر نظم لکھی تھی جو ۱۹۰۱ میں اردو رسالہ "مخزن" میں چھپ کر پورے برصغیر میں اقبال کی شہرت کا سبب بنی تھی۔ ملاحظہ ہو کہ اقبال کی خوبی اسی میں ہے کہ جب وہ ایرانیوں اور دنیا کے دوسرے فارسی زبان والوں سے فارسی میں بات کرتا ہے، اور اسے اس بات کا علم ہے کہ ان فارسی بولنے والوں کی خاصی تعداد نے (جو ایرانی نہیں ہیں) خود اس کی طرح فارسی زبان کتبِ فارسی کے مطالعہ سے سیکھی ہے اور صرف ان چیزوں یا باتوں سے آشنا ہے جو فارسی نظم و نثر کی کتابوں میں مندرج ہیں، تو وہ ہمالیہ کی سر بفلک چوٹی کو، جس سے وہ خود اور برصغیر کے فارسی دان لوگ بخوبی واقف ہیں، ایک طرف رکھ کر کوہ الوند کو عظمت، بلندی اور تسخیر ناپذیری کے مظہر کے طور پر اپنے فارسی کلام میں پیش کرتا ہے۔

اب تک جو کچھ میں نے اس سلسلے میں عرض کیا ہے اس میں اور غیر ایرانی افراد کے ناموں کے ذکر میں، جن سے اس نے اپنے روحانی سفر "جاوید نامہ" میں ملاقات اور گفتگو کی یا اپنی دوسری تصانیف میں ان کا نام لیا ہے، منافرت نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے یہ ضروری جانا ہے کہ وہ ان کا نام لے، ان کے افکار کا ذکر کرے اور ان کے نظریات کو

تنقید کی کسوٹی پر پرکھے۔

اقبال کے فارسی کلام میں ہمیں ایران کے ان بادشاہوں اور پہلوانوں کے اسما بھی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ایران کے قبل از اسلام اور اسلامی دور کے تاریخی بادشاہوں کے عہد کی زیب شاعری میں آیا ہے۔ پھر ان سے متعلق موضوعات کی طرف بھی متعدد اشارے ملتے ہیں جیسے: فرشاہنشہی، جم، جمشید، جامِ جم، فریدون، درفش کاویانی، محمود غزنوی، طغرل، سنجر، نادر پہلوی؛ اسی طرح زردشت، زرتشتیان، گبر، یزدان، اہرمن، مزدک، ارژنگ اور زبان پہلوی (فارسی) ——— اقبال نے ایسے ہی الفاظ و تلمیحات سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے یہاں محض مثال کے طور پر مختصراً صرف دو مواقع کا ذکر کیا جاتا ہے:

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر [۳۲]

کارگاہِ زندگی را محرم است
او جم است و شعرِ او جامِ جم است [۳۳]

"پرویز کا دور گذر چکا اے کشتۂ پرویز اٹھ۔ اپنی گم گشتہ نعمت کو خسرو سے واپس لے
وہ زندگی کی کارگاہ سے آگاہ ہے۔ وہ جمشید ہے تو اس کی شاعری جامِ جمشید ہے۔"

اقبال ایران کے دشمنوں کو بھی نہیں بھولا۔ کلام کے اقتضا کے مطابق ان کا بھی اس نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے جیسے: تورانیان، اسکندر، چنگیز، ہلاکو، تیمور۔ پھر جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہیں کہیں اس نے ایران کی تاریخ سے متعلق بعض خاص بڑی بڑی شخصیات کے ناموں سے اسم جنس یا صفت نسبی بنا کر اپنی بات پیش کی ہے، مثلاً: پرویزانِ این عصر، دورِ پرویزی کا طے ہو جانا، خاقانی و فغفوری جمشیدی و دارائی، آشوبِ ہلاکوئی، ہنگامۂ چنگیزی، سدِ سکندری، آئینِ اسکندری، طنطنۂ سکندری اور جنگ و آہنگِ تیموری۔ . . . .

ایک اور موضوع جس سے یہاں مختصر الفاظ میں بحث کرنا ضروری ہے وہ ہے اقبال کا خود اپنی زندگی کے دوران میں ایران اور ایرانیوں کے بارے میں نظریہ۔ چونکہ یہ اظہارِ نظر ہر طرح سے عالمِ اسلام کے

اتحاد اور عالمی اسلامی حکومت کی تشکیل کی ضرورت کے بارے میں ہے اور اس کے اجتماعی اور سیاسی فلسفے سے وابستہ اور اس اتحاد وغیرہ کے نتیجے میں مسلمان اقوام کی افراط کی حد تک ملت پرستی اور ملیت یعنی نیشنلزم کی طرف عدم توجہی کی ضرورت سے مربوط ہے۔ اس لیے بندہ یہاں، اس بحث کے جواب میں جس کا آغاز کیا گیا ہے، اس فلسفے کی طرف بہت ہی مختصر اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو زوالِ مسلمانی، دنیا بھر کے مسلمانوں کے ضعف و بیچارگی اور اسلامی ممالک میں ملّاؤں اور صوفیوں کی بے اعتنائی سے بے حد دکھ پہنچا ہے (چنانچہ وہ کہتا ہے) ؎

در مسلمانان مجو آن ذوق و شوق!
آن یقین، آن رنگ و بو آن ذوق و شوق
عالمان از علم قرآن بی نیاز
صوفیان درنده گرگ و مو دراز
گرچه اندر خانقاهان های و هوست
کو جوانمردی که صهبا در کدوست
هم مسلمانان افرنگی مآب
چشمهٔ کوثر بجویند از سراب

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

بی نصیب از سرِّ دین اند این همه
اهل کین اند، اهل کین اند این همه

— — — — — — — —

— — — — — — — — —

بآن بالی که بخشیدی پریدم
به سوزِ نغمه های خود تپیدم
مسلمانی که مرگ از وی بلرزد
جهان گردیدم و او را ندیدم

"مسلمانوں میں وہ پہلا سا ذوق و شوق مت تلاش کر، وہ یقین وہ
رنگ و بو اور ذوق و شوق نہ تلاش کر
علامۂ آن کے علم سے بے نیاز تو صوفیا پھاڑ کھانے والے بھیڑیے اور
لمبے بالوں والے ہیں
اگرچہ خانقاہوں میں ہُو حق ہُو حق کا شور ہے لیکن ان میں ایسا جوانمرد
کہاں ہے جس کے کدو یعنی جام میں شراب ہو
پھر مغرب زدہ مسلمان ہیں جو سراب میں چشمۂ کوثر ڈھونڈ رہے ہیں
یہ سب دین کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ یہ سب اہل کیں ہیں، یہ
سب کمینے سے پُر ہیں
جو پَر تُو نے مجھے عطا کیا تھا میں اس سے اُڑا، اپنے نخوں کے سوز
میں تڑپا
ایسا مسلمان جس سے موت کانپ اٹھے، مجھے تو دنیا بھر میں کہیں
بھی نظر نہ آیا۔

خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی ذلت، پسماندگی اور بے یقینی کو (کہ وہ خود بھی یہیں کا ایک فرد تھا) تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے اس کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ برصغیر کی تاریکی بھی کبھی چھٹ جائے۔ اس سلسلے میں وہ خود کہتا ہے ؎

دگرگوں کشور ہندوستان است
دگرگوں آں زمین و آسمان است
مجو از ما نمازِ پنجگانہ
غلاماں را صف آرائی گران است [۳۶]

"برصغیر کی حالت دگرگوں ہے۔ وہ زمین و آسماں دگرگوں ہے۔
ہم سے پانچ وقتوں کی نماز نہ چاہو، کیونکہ غلاموں کو صف آرا ہونا
گراں گذرتا ہے۔"

اقبال کے نزدیک دنیا کے مسلمانوں کی اس تمام بدبختی و سیاہ روزی کے کچھ اسباب ہیں۔

اوّل یہ کہ چونکہ وہ خود اعتمادی سے محروم ہو چکے ہیں اسی لیے ہر ذلت وخواری پر راضی رہتے ہیں! لہٰذا سب سے پہلے ان میں "خودی" کا بیدار کرنا ضروری ہے۔

اس مرض کے علاج کے طور پر وہ اپنی کتاب "اسرارِ خودی" میں ایک جگہ کہتا ہے

ع خود را بشناس و دریاب

"اپنے آپ کو پہچان اور پا جا"

اور کتاب "رموزِ بیخودی" میں اس پر اضافہ کرتا ہے: کہ جب تو نے اپنے آپ کو پا لیا تو اب ضروری ہے کہ اپنی ملت میں گم ہو جا!"

پھر کہتا ہے کہ ایک مسلمان کی ملت اسلامی معاشرہ ہے نہ مختلف قسم کی جغرافیائی حدود۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں دنیا کے مسلمانوں کو ایک تنِ واحد کی صورت میں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے الگ الگ ملکوں کی صورت میں نہیں ۔

مردمی اندر جہان افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند[۳۷]

"مردمی دنیا میں قصہ کہانی بن کے رہ گئی ہے۔ آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا ہے
روح جسم سے خارج ہو گئی اور سات حصے جسم کے رہ گئے۔ آدمیت جاتی رہی اور اقوام رہ گئیں!

اس سلسلے میں اقبال کا یہ نظریہ بھی تھا کہ دنیا کے مسلمان جو اس بری حالت کو پہنچے ہیں تو اس کا ایک سبب ان کا "خلافت" کی بنیاد پر طرزِ حکومت کو چھوڑ کر دوسرے طرز ہائے حکومت کی طرف مائل ہونا ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال صدرِ اسلام کے معتقد ایک مسلمان کی طرح اس بات پر اظہارِ مسرت کرتا ہے کہ اسلام نے "لا قیصر و کسریٰ" کا مژدہ سنایا، "قیصر و کسریٰ" کا طلسم توڑا اور خود "تختِ ملوکیت" پر بیٹھ گیا۔

تمدن اور علم و دانش کے قافلے سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کا ایک باعث، اقبال کے نزدیک، ان کا اہلِ مغرب کی تقلید کرنا تھا۔ تاہم مشرق کی اصالت پر اس کا پختہ یقین تھا اور وہ اس مت[illegible]

پہنچ چکا تھا کہ مغرب والے ہماری خاطر دل نہیں جلاتے ؎

ترا نادان، امیدِ غمگساریہا ز افرنگ است
دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغی کہ در چنگ است[۳۸]

"نادان! تجھے فرنگیوں سے غمگساری کی امید ہے؟ (یاد رکھ کہ) شاہین
کا دل کبھی اُس پرندے پر نہیں کُڑھتا جو اس کے پنجے میں ہوتا ہے"۔

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب
باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب[۳۹]

"مشرق، مغرب کی تقلید کر کے خود کو کھو بیٹھے گا، ان اقوام (مشرق)
کو تو مغرب پر تنقید کرنا چاہیے"۔

(یہاں فاضل مقالہ نگار نے اقبال کی مغرب سے بیزاری اور مسلمانوں کی تقلیدِ فرنگ پر اپنی ناراضی کی چند باتیں کی ہیں، جنھیں چھوڑ دیا گیا ہے)۔

ایسے اجتماعی و سیاسی فلسفے کا حامل ہونے کے باعث، نیز دنیا بھر کے مسلمانوں سے اسے جو تعلقِ خاطر تھا (اور اسی بنا پر وہ "خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز" کو اپنی آنکھوں کی روشنی قرار دیتا ہے)۔ اس کے پیشِ نظر اس نے پیامِ مشرق میں بھی تمام مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے (جیسے عربوں، مصریوں، آلِ عثمان اور اہلِ برصغیر پر) ایرانیوں کو بھی لیا ہے، اسی طرح جاوید نامہ میں بھی اس نے ایرانیوں پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے کہ:

"ایرانی بھی ایک عرصے کی خاموشی کے بعد اب سب کاموں میں اہلِ مغرب
کی پیروی میں مصروف ہو گئے ہیں"۔

اسی ضمن میں وہ ایک اور جگہ یوں لب کشا ہے ؎

ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ
ہر کسی را در گلو شستِ فرنگ[۴۰]

"ترک، ایران اور عرب ابھی مغرب میں محو ہیں۔ ہر کسی کے حلق میں
مغرب ہی کا کانٹا (پھنسا ہوا) ہے"۔

جاوید نامہ میں نادر شاہ افشار سے باتوں کے دوران اقبال نے اس سلسلے میں اپنے نظریات تفصیل سے بیان کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ "عزم و ہمت" پہلوی

اور ایران کی حکومتِ وقت (جو اب انقلاب کی نذر ہو چکی ہے۔ م) ایران کے مسلمانوں کی مشکلات دور کرنے کی اہلیت رکھتی ہے ؎

آنچه بر تقدیرِ مشرق قادر است
عزم و حزمِ پہلوی و نادر است
پہلوی آن وارثِ تختِ قباد
ناخنِ او عقدهٔ ایران گشاد[۴۱]

"وہ چیز جو مشرق کی تقدیر بدلنے کی اہلیت رکھتی ہے وہ پہلوی
عزم و حزم اور نادر ہے
وہ پہلوی جو تختِ قباد کا وارث ہے اور جس کے ناخنِ (تدبیر)
نے ایران کی گتھی کو سلجھا دیا"

اجازت ہو تو یہ نکتہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس ناچیز کی نظر میں گزشتہ چودہ صدیوں سے ایرانیوں کا ایک طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ اس بات پر فخر کے ساتھ ساتھ، کہ وہ مسلمان ہیں اور قرآن مجید، پیغمبرِ بزرگ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ائمۂ اطہار کے ساتھ صدق و خلوص کے ساتھ اظہارِ عقیدت و ارادت رکھتے ہیں، اس وجہ سے بھی کہ وہ ایرانی ہیں اور قدیم و درخشاں اور انسان ساز تمدن و فرہنگ سے بہرہ ور رہے ہیں، خود کو دنیا میں سربلند محسوس کرتے ہیں، لیکن اقبال کے مطابق فرنگیوں کی پیروی کے بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، بالکل اسی طرح گزشتہ برسوں میں یہ موضوع ایران کے علاوہ ایشیا اور افریقہ حتیٰ کہ لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بھی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور اربابِ نظر ان براعظموں کے عوام کو مغرب زدگی اور خود کو یورپ اور امریکہ کے سامنے شکست خوردہ سمجھنے سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اپنی ان معروضات کے اختتام پر میں پاکستان کے نامور فلسفی و شاعر محمد اقبال لاہوری کی روح پر سلام بھیجتے ہوئے یہ حقیقت بیان کرنا چاہوں گا کہ اگرچہ اس نے اپنے آپ کو تنہا اور غریب الدیار جانا اور کہا:

من اندر مشرق و مغرب غریبم
کہ از یاران محرم بی نصیبم

غمِ خود را بگویم با دلِ خویش
چہ معصومانہ غربت را فریبم [۴۲]

"میں مشرق اور مغرب میں اجنبی ہوں، کیونکہ محرم دوستوں سے
محروم ہوں
میں اپنا غم اپنے ہی دل سے کہہ لیتا ہوں، کیا معصومانہ انداز میں میں
اپنی اجنبیت کو فریب دے رہا ہوں"۔

لیکن آج خوش بختی سے مشرق و مغرب، مسلم اور غیر مسلم ممالک میں اقبال کے بے شمار دوست اور ارادتمند ہیں، اس کی تصنیفات مختلف زبانوں میں پڑھی جا رہی ہیں اور ان سے متعلق لوگ بحث وغیرہ کرتے ہیں۔ اگرابھی تک اس کی آرزوؤں میں سے کچھ کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا ــــــ جیسے ایک عالمی اسلامی حکومت کی تشکیل ــــــ تو کم از کم تاریخ کے اس مقام پر ہم پہنچ چکے ہیں جہاں ایشیا اور افریقہ کے بہت سے مسلمان بیدار ہوکر تھوڑی ہی مدت میں آزادی سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ دنیا کے تمام مسلم ممالک اپنے شایانِ شان مقام و مرتبہ کے حصول میں کامیاب ہوں، میں اپنے مضمون کو اقبال سے متعلق ملک الشعرا بہار (مرحوم) کے ان چند اشعار پر ختم کرتا ہوں ـــ

بیدلی گر رفت اقبالی رسید
بیدلان را نوبت حالی رسید
ہیکلی گشت از سخن گوئی بپا
گفت "کل الصید فی جوف الفرا"
قرن حاضر خاصہ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاراں بر گذشت

"اگر ایک بیدل چلا گیا تو اس کی جگہ ایک اقبال پہنچ گیا۔
اربابِ عشق کے لیے حال کا وقت آپہنچا
شاعری کا ایک پیکر وجود میں آیا، جس نے کہا کہ تمام شکار گورخر کے
پیٹ میں ہوتا ہے ــــ یعنی دوسرے شعراس کے آگے مات
ہو گئے۔

موجودہ صدی، خاص اقبال کی صدی قرار پائی ہے۔ وہ ایک ایسا
اکیلا تھا جو لاکھوں سے (اہمیت کے لحاظ سے) بڑھ گیا!"

حواشی

۱۔ کلیاتِ اقبال فارسی: ص ۵۱۷
۲۔ ایضاً ص ۱۰۲۱
۳۔ ایضاً ص ۹۲۴
۴۔ ایضاً ص ۴۹
۵۔ ایضاً ص ۱۱
۶۔ ایضاً ص ۸۹۴
۷۔ ایضاً ص ۳۲
۸۔ ایضاً ص ۳۲
۹۔ ایضاً ص ۹۳۸
۱۰۔ ایضاً ص ۸، ۹
۱۱۔ ایضاً ص ۶۰۶
۱۲۔ ایضاً ص ۵۲۷
۱۳۔ ایضاً ص ۵۳۸
۱۴۔ ایضاً ص ۸۶۲
۱۵۔ ایضاً ص ۹۰۷
۱۶۔ ایضاً ص ۲۰۹
۱۷۔ ایضاً ص ۸۳۶
۱۸۔ ایضاً ص ۲۱
۱۹۔ ایضاً ص ۸۶۷
۲۰۔ ایضاً ص ۹۰۵
۲۱۔ ایضاً ص ۲۸۲
۲۲۔ کلیاتِ اقبال فارسی ص ۷۰۵
۲۳۔ ایضاً ص ۱۰۵
۲۴۔ ایضاً ص ۴۷۵
۲۵۔ ایضاً ص ۳۳۱
۲۶۔ ایضاً ص ۴۴۳
۲۷۔ ایضاً ص ۴۶۵
۲۸۔ ایضاً ص ۲۷۵
۲۹۔ ایضاً ص ۴۸۶
۳۰۔ ایضاً ص ۴۸۷
۳۱۔ ایضاً ص ۱۲۷
۳۲۔ ایضاً ص ۳۶۷
۳۳۔ ایضاً ص ۷۵۸
۳۴۔ ایضاً ص ۷۹۴
۳۵۔ ایضاً ص ۹۲۲
۳۶۔ ایضاً ص ۸۹۹
۳۷۔ ایضاً ص ۱۱۵
۳۸۔ ایضاً ص ۵۲۱
۳۹۔ ایضاً ص ۷۶۶
۴۰۔ ایضاً ص ۶۵۰
۴۱۔ ایضاً ص ۷۶۸
۴۲۔ ایضاً ص ۹۳۳